تقریر: مولانا خیر محمد جالندھریؒ
تحریر: مولانا قاری خلیل الرحمٰنؒ
تحقیق وتعلیق: مولانا محمد انس حسان

الامالی لجامع صحیح البخاری

(۱)

ان صفحات میں مشہور عالم دین مولانا خیر محمد جالندھریؒ کے مستند اور محقق ''امالی بخاری'' کی قسط وار اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے، جسے مولانا قاری خلیل الرحمٰنؒ نے قلم بند کیا اور ان کے فرزند مولانا محمد انس حسان نے اس پر تعلیقات تحریر فرمائے۔ اس شمارے میں صاحب امالی اور راقم امالی کے مختصر سوانحی تعارف کے بعد اس کا مقدمہ پیش خدمت ہے، جو اصول حدیث سے تعلق رکھتا ہے۔ ان صفحات میں اس مقدمے کی قسط اول پیش کی جارہی ہے۔ ادارہ

''صحاح ستہ'' کے نام سے حدیث شریف کی چھ کتابیں مسلمانوں میں انتہائی معتمد سمجھی جاتی ہیں، ان میں بخاری شریف اور مسلم شریف، صحیحین اور باقی سننِ اربعہ کہلاتی ہیں۔ امام بخاریؒ (۱۹۴ھ۔۲۵۶ھ) کی صحیح بخاری صحت وعلوسند کے لحاظ سے باقی کتب سے ممتاز ہے۔ اس کا پورا نام ''الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ ﷺ وسننہ وایامہ'' ہے۔ اسے ''الجامع الصحیح'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ فن حدیث کے آٹھوں ابواب اس میں جمع ہیں۔ صحیح بخاری صحتِ سند، فقہ حدیث اور تحریر تراجم کے لحاظ سے حدیث کا وہ عدیم النظیر مجموعہ ہے، جسے اہلِ علم نے

بہ جا طور پر ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' قرار دیا ہے۔ صحت و جامعیت میں اول درجے کی کتاب ہونے کی وجہ سے علمائے حدیث نے اس کی تشریح و توضیح کا خصوصی اہتمام فرمایا ہے۔ ہر دور میں اس کی مختصر و جامع اور مطول و مبسوط شروح لکھی گئیں۔ اندلس کے مشہور محدث ابو محمد عبداللہ بن ابی جمرہؒ (م ۶۹۹ھ) نے ''بہجۃ النفوس'' کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں شرح لکھی۔ علامہ زرکشیؒ (م ۷۹۴ھ) نے چھ ضخیم جلدوں میں شرح تحریر فرمائی۔ علامہ ابنِ حجر مکیؒ (م ۸۹۲ھ) نے ''فتح الباری'' لکھی، جو بارہ جلدوں میں بخاری کی بہترین شروح میں شمار ہوتی ہے۔ اسی دور میں علامہ بدرالدین عینی حنفیؒ (م ۸۵۵ھ) نے ''عمدۃ القاری'' تحریر فرمائی، جو بہت دقیق اور محققانہ شرح ہے۔ علامہ شہاب الدین قسطلانیؒ (م ۹۶۳ھ) نے ''ارشاد الساری'' کے نام سے شرح لکھی۔ ماضی قریب کے اکابر علما کی شروح میں ''لامع الدراری'' (تقریر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) اور ''فیض الباری'' (تقریر حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ) نہایت بیش قیمت ہیں۔ اول الذکر کی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ نے تفصیل کی ہے۔ مؤخر الذکر کے جامع حضرت مولانا بدر عالم مدنیؒ ہیں۔

شروح کے علاوہ بخاری شریف کی تدریس بھی خلفاً عن سلف نہایت اہتمام سے کی جاتی رہی ہے۔ اس کی اہمیت و عظمت، دقائق اور فقہ حدیث کے پیش نظر ہر دور میں اسے وقت کے ممتاز و مقتدر اور علم و فضل میں فائق الاقران محدثین نے پڑھایا اور املا کرایا۔ محدثین کی املا کرائی جانے والی احادیث امالی کہلاتی ہیں۔ حاجی خلیفہ نے اس طرز کی ۷۲ کتب امالی کی فہرست پیش کی ہے، جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ امالی کی روایت بہت قدیم ہے۔ مشہور کتبِ امالی میں ''الامالی لابن شاہین'' (م ۳۸۵ھ)، ''الامالی لابن مندہ'' (م ۵۱۱ھ)، ''الامالی لابن عساکر'' (م ۵۷۱ھ)، ''الامالی لابن حاجب'' (م ۶۴۶ھ) خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

استاذ العلما عارف باللہ حضرت مولانا خیر محمد جالندھری قدس سرہٗ (خلیفۂ ارشد حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز) کو کم و بیش چالیس سال تک بخاری شریف کی تدریس کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپؒ کا اندازِ تعلیم منفرد، جامع اور عام اساتذہ سے مختلف تھا، سبق کی تقریر حشو و زوائد سے مبرا، مضمون مرتب، طریقِ تفہیم سادہ و دل نشیں اور مباحث پُر مغز

ہوتے تھے۔ پڑھاتے وقت صرف کتاب کے حل پر اکتفانہ فرماتے، بل کہ غیر معمولی علمی استعداد و ذوق کے مطابق فن کی اہم تدقیقات اور ضروری مسائل پر بھی مختصر، مگر جامع کلام فرماتے، تاکہ طلبہ کتاب کی تکمیل کے علاوہ فن کی ضروری مباحث سے ناآشنا نہ رہیں۔ بخاری شریف اور حدیث شریف کی دیگر کتب کی تدریس میں اولاً سادہ اور مطلب خیز ترجمہ کرنے کا معمول تھا۔ بعدازاں اس حدیث سے استنباط کردہ فقہی مسائل اور ائمہ مجتہدین کے اقوال و مذاہب مختصر دلائل کے ساتھ بیان فرماتے۔ آخر میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مذہب اور اس کے دلائل وشواہد بسط وتفصیل کے ساتھ بیان فرماتے۔

آپؒ کی تقاریر ''خیر الکلام ماقل ودل'' کا مصداق ہوتیں۔ لمبی مباحث کو چند جملوں میں سمیٹ کر دریا کو کوزے میں بند کرنے میں آپؒ کو کمال حاصل تھا۔ عام طور پر اساتذہ حدیث کے تدریسی سال کا بیش تر حصہ عبادات کے اختلافی مسائل پر صرف ہو جاتا ہے اور سال کے آخر میں سلسلۂ تلاوت و برکت چلتا ہے۔ حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ اس بات کا خصوصی اہتمام فرماتے کہ آغاز سال ہی سے مقدارِ خواندگی ایک خاص رفتار و معیار سے جاری رہے، یہاں تک کہ کسی تعب اور اضافی وقت کے بغیر سال کے اختتام پر کتاب نہایت سہولت سے ختم ہو جاتی اور کوئی بحث طلب مقام اور قابلِ توضیح حدیث تلاوتاً نہ گزرتی۔ مختلف فیہ مسائل میں ائمہ و مجتہدین کے اقوال و مذاہب اور دلائل کامل احترام کے ساتھ بیان فرماتے۔ حنفی مسلک کے دلائل پر محققانہ و منصفانہ کلام فرماتے۔ آپؒ اگرچہ ایک قادر الکلام اور کامیاب مناظر تھے، مگر تدریس کا طرز مناظرانہ و مجادلانہ ہرگز نہ تھا۔ محققانہ طرز، متکلمانہ استدلال اور منصفانہ تجزیہ آپؒ کے درسِ حدیث کی خصوصیات تھیں۔

آپؒ کے بے شمار تلامذہ نے آپ کے درسی افادات قلم بند فرمائے، جو جامعین کے پاس ایک نادر علمی یادگار کے طور پر محفوظ ہیں۔ ان ہی ممتاز تلامذہ میں والد ماجد مولانا قاری خلیل الرحمٰنؒ بھی ہیں، جنہوں نے مولانا خیر محمد جالندھریؒ کی تقریر بخاری کو نہایت اہتمام، احتیاط اور صحت کے ساتھ نقل فرمایا ہے۔ اس تقریر کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مولانا خیر محمد جالندھریؒ کی نظر سے گزری ہے اور مولانا عبداللہ درخواستیؒ اس کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ نیز وقت کے جید

علمار اقم سے اس ''امالی'' کے قلمی نسخے کی کاپی لے کر استفادہ کرتے رہے ہیں۔ یہ افادات طلبہ و اساتذۂ حدیث کے لیے ایک بیش قدر علمی تحفہ ہیں، اور اس کا مطالعہ انہیں بہت سی شروح و تقاریر سے ان شاء اللہ العزیز مستغنی کر دے گا۔

قبل اس کے اصل امالی کے مندرجات پیش کیے جائیں، ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مولانا خیر محمد جالندھریؒ اور مولانا قاری خلیل الرحمٰنؒ کا مختصر تعارف کرادیا جائے۔ مولانا خیر محمد جالندھریؒ کا تعارف تو خود ان کی مختصر خودنوشت سوانح حیات سے ماخوذ ہے، جب کہ مولانا قاری خلیل الرحمٰنؒ کا تعارف راقم کا تحریر کردہ ہے۔

مولانا خیر محمد جالندھریؒ

خودنوشت سوانحِ حیات

ہمارا خاندان ددھیال ان پڑھ اور زمیں دار پیشہ تھا۔ قوم ارائیں تھی۔ والد کا نام الٰہی بخش ولد خدا بخش تھا۔ یہ خاندان پڑھا لکھا تھا، اردو فارسی حکمت وطب کا علم رکھتا تھا۔ چناں چہ میرے حقیقی ماموں میاں شاہ محمد ولد میاں شیر محمد بڑے عزت والے سمجھے جاتے تھے، ماموں صاحب میاں شاہ محمد تمام برادری کی رسومات کو چھوڑ کر قطب الارشاد وامام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے اور ذکر و شغل کی طرف متوجہ ہوئے اور ذکر جہر میں مشغول ہوئے اور آخر وقت تک دینیات وقرآن مجید کی تعلیم دیتے رہے۔ ہم پانچ بھائی تھے اور ایک بہن تھی۔ تین بڑے بھائی کھیتی باڑی میں مشغول تھے۔ یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے۔ والدہ مرحومہ رحمۃ اللہ علیہا نے مجھے اور چھوٹے بھائی مولوی حافظ غلام محمد مرحوم کے ہاتھ پکڑ کے ماموں مرحوم کے سپرد کیے کہ ان دونوں کو پڑھاؤ، انہوں نے خود حساب کتاب، تاریخ، جغرافیہ، قرآن شریف ہم لوگوں کو پڑھا کر اپنی نگرانی میں دوسرے مدارس میں بھیجا۔

احقر کی پیدائش برمکان ماموں شاہ محمد مرحوم بہ مقام عمروال بلہ تحصیل نکودر ضلع جالندھر ۱۳۱۲ھ یا ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں ہوئی۔ ۱۳۱۲ھ کے اعتبار سے تاریخی نام ۱۳۱۲ھ/ محمد مظفر، ۱۳۱۲ھ/ چراغ حق ہے۔ ۱۳۱۳ھ کے اعتبار سے تاریخی نام ۱۳۱۳ھ/ راغب علی۔ میرے

ایک دوست مولانا قمرالدین صاحب اس وقت پڑھتے تھے، انہوں نے ایک شعر کہا تھا:

محمد مظفر چراغ

بحق فی علومك فی الدیار

بچپن کا زمانہ عمروال بلہ میں ایسا بے ہوشی کا کھیل کود میں گزرا کہ کوئی بات یاد نہیں۔ تخمیناً سات سال کی عمر میں والدین چک ۲۵۲ گ ب ضلع لائل پور میں گئے اور ہم دونوں کو بھی ہم راہ لے گئے۔

اس چک کے امام حافظ پیر محمد (نابینا) تھے۔ تقریباً پہلا پارہ میں نے ناظرہ ان سے پڑھا۔ پھر چند سال وہاں ٹھہر کر وطن واپس ہوئے۔ عمروال بلہ کی مسجد میں ایک امام صاحب تھے، ان سے ناظرہ اٹھارہ پارے پڑھے۔ اس وقت میری عمر تقریباً دس سال تھی۔ بعدازاں ماموں صاحب سے اردو کی سرکاری کتابیں اور تاریخ کی کتابیں پڑھیں۔ ساتھ ہی لکھنا اور حساب بھی سیکھا۔

پھر ماموں صاحب نے شروع شوال ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں مدرسہ رشیدیہ نکودر ضلع جالندھر داخل کرا دیا۔ اور اس مدرسے میں فارسی کی ابتدائی کتابیں شعبان ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۷ء تک پڑھیں۔ اسی سال حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور اسی سال طاعون ہوا، جس میں میرے دو بڑے بھائی فوت ہوئے۔ اور میرا نکاح بھی شریعت کے مطابق برادری کی تمام رسومات سے خالی اسی سال ہوا۔ پھر مدرسہ صابریہ رائے پور گوجراں ضلع جالندھر حضرت مولانا فضلی احمد صاحب کے پاس داخل ہوا، جو ہمارے گاؤں سے ایک میل دور تھا۔ صبح وہاں جاتا، شام کو گھر آجاتا تھا۔ حضرت مولانا فقیراللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) وہاں دوسرے سال مدرس ہو گئے۔ (شوال ۱۳۲۴ھ سے تقریباً ماہ ربیع الاوّل ۱۳۲۸ھ تک ابتدائی عربی کتابیں صَرف، نحو، فقہ، منطق وفلسفہ، ادب کی پڑھیں۔) حضرت مولانا فضل احمد صاحب بہت نیک طینت، حلیم الطبع، عالم ربانی مدرسہ عبدالرب دہلی کے فارغ تھے، اور شیخ طریقت مولانا شاہ عبدالرحیم قدس سرہٗ سے متوسل تھے۔ ۵ رجب ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۱ نومبر ۱۹۶۴ء میں ۹۵ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ حضرت مولانا فقیراللہ صاحب مرحوم نے ابتدائی کتب اور متوسط اپنے وطن میں اور مدرسہ نعمانیہ میں پڑھ کر پھر سہارن

پور مدرسہ مظاہر العلوم اور دار العلوم دیوبند میں تین چار سال داخلہ لیا، حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی سے سندِ فراغ حاصل کی اور حضرت موصوف دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے مرید ہوئے۔ بہت باشریعت، پرہیز گار عالمِ دین تھے، استاذِ شفیق و مہربان تھے۔ تقریباً ۵۰ سال دین کی تعلیم اور افتا کی خدمت کر کے ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۱ فروری ۱۹۶۳ء میں خدا کو پیارے ہوئے۔

فقیہ و عالم حق مفتی فقیر اللہ
جو ہر خلاف شریعت پہ کرتے تھے توبیخ
خدا کے خاص مقرب تھے حضرت والا
کہ خاص خاص سے نکلی وفات کی تاریخ

۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۸ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۹۱۰ء سے ۱۵ رمضان المبارک ۱۳۲۸ھ مطابق ۲۰ ستمبر ۱۹۱۰ء اور ۳۰ سال بعد اوائل جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ مطابق اپریل ۱۹۱۳ء میں تین تین ماہ بہ خدمت حضرت مولانا سلطان احمد کے پاس رہ کر مختلف کتب کے کچھ کچھ حصے پڑھے، وہ استاد دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیے ہوئے تھے اور مولوی فاضل اورینٹل کالج لاہور کے بہت بڑے ادیب تھے، ان کے والد حضرت مولانا محمود صاحب بہت بڑے مناظر، حضرت گنگوہیؒ کے شاگرد تھے۔ پھر مدرسہ منبع العلوم گلاوٹی میں تین سال رہ کر مولانا غلام نبی سرحدی، حضرت مولانا کریم بخش پنجابی، حضرت مولانا محی الدین صاحب مہتمم مدرسہ ھذا سے علم ہیئت، فقہ، اصولِ فقہ، منطق، فلسفہ، فرائض، معانی وغیرہ حاصل کیے۔ یہ تینوں اساتذہ بے نظیر اور قابلِ تعریف تھے۔ پھر مدرسہ اشاعت العلوم بانس بریلی پہنچ کر داخلہ لیا، ۱۳۳۲ھ مطابق دسمبر ۱۹۱۳ء چار سال شعبان ۱۳۳۵ھ تک چار اساتذہ کے سامنے زانوتہ کیے۔ حضرت مولانا محمد یاسین صاحب، مولانا عبدالرحمٰن صاحب سلطان پوری، حضرت مولانا سلطان احمد صاحب پشاوری اور حضرت مولانا سلطان احمد بریلی چاروں اساتذہ لاثانی تھے۔ اس عرصے میں طبقہ علیہ اور فنون کی تمام کتابیں پڑھیں اور محدث عصر حضرت مولانا محمد یاسین صاحب سرہندی سے سندِ حدیث حاصل کی، مولانا محمد یاسین صاحب سرہندی اور مولانا سلطان احمد صاحب بریلوی دونوں شاگرد مولانا شیخ الہند صاحب

دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔

شعبان ۱۳۳۵ھ کے آخر میں مدرسہ اشاعت العلوم بریلی میں جلسہ سالانہ ہوا۔ اس میں سندِ فراغ وسندِ تکمیل حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب قاسمی، مہتمم دارالعلوم دیوبند کے متبرک ہاتھوں سے عطا ہوئی۔

شوال ۱۳۳۵ھ سے شعبان ۱۳۳۶ھ تک اسی مدرسہ اشاعت العلوم بریلی میں حضرت مہتمم صاحب کے حکم سے مدرس مقرر ہوا اور متوسط کتابیں پڑھائیں۔ شوال ۱۳۳۶ھ سے لے کر ماہ ربیع الاوّل ۱۳۴۵ھ تک بہ استثنا ایک سال (شوال ۱۳۴۱ھ) منڈی صادق گنج میں صدر مدرسی پر فائز رہا اور مکمل نصاب کا کئی مرتبہ درس دیا۔ اساتذہ کرام مولانا فضل احمد و مولانا فقیر اللہ صاحب کے حکم سے منڈی صادق گنج سے ایک سال کی رخصت لے کر ہر دو صاحب زادوں مولوی محمود الحسن و مولوی عبدالرشید کو پڑھانے کے لیے آیا۔ اساتذہ رائے پور گوجراں کے حکم سے ناظم تعلیمات مقرر ہو کر جالندھر پہنچا۔ اس وقت وہاں صدر مدرس، مولانا احمد بخش و مدرس میرے چھوٹے بھائی مولوی غلام محمد تھے۔ دونوں یکے بعد دیگرے فوت ہو گئے۔ میں ۱۹ جمادی الاولیٰ/ ۱۳۴۵ھ مطابق ۲۵/ نومبر ۱۹۲۶ مدرسہ عربی فیض محمدی جالندھر پہنچا اور شعبان ۱۳۴۹ھ مطابق جنوری ۱۹۳۱ء سلسلہ تعلیم و تدریس کا جاری رہا۔ دورۂ حدیث بھی کئی مرتبہ ہوا۔ پھر مدرسہ فیض محمدی بند ہو گیا۔

جب شعبان ۱۳۴۹ھ میں مدرسہ فیض محمدی کا سلسلہ ختم ہوا تو حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ لیا گیا، آپ نے فرمایا کہ بہ نسبت دیہات کے شہر میں رہنا زیادہ مفید ہوگا۔ اس لیے شہر میں رہنے کی تجویز ہوئی اور مدرسے کا نام خیر المدارس رکھا گیا اور تین وصیتیں فرمائیں:

۱۔ مدرسہ کی بنیاد کسی غنی یا افسر کے بھروسے پر نہ رکھی جائے، بل کہ محض توکلا علی اللہ خدا ہی کے بھروسے پر رکھی جائے۔

۲۔ عملے کی کوئی خاص مقدار خود تجویز نہ کی جائے، بل کہ یہ اندازہ رکھا جائے کہ حق تعالیٰ جتنی توفیق دیں گے، اتنے ہی رکھیں گے، اگر گنجائش زیادہ ہوئی تو عملہ بڑھا لیا جائے گا اور اگر گنجائش کم ہو گئی تو عملہ گھٹا دیا جائے گا۔

۳۔غربا کے چندے کو اُمرا و اغنیا کے چندے پر ترجیح دی جائے گی، اس لیے کہ اُمرا چندے دے کر منتظر ہوتے ہیں کہ ہماری تعریف کی جائے اور شکریہ ادا کیا جائے۔اس میں بے برکتی ہوتی ہے۔اور غربا دے کر شکر گزار ہوتے ہیں کہ ہمارا روپیہ نیک مقصد کے لیے قبول کرلیا گیا۔اس میں عنداللہ برکت ہوتی ہے۔

حضرت اقدس نے مدرسے کی سرپرستی بھی قبول فرمائی، چناں چہ احقر نے حضرت مولانا احمد بخش اور مولانا محمد علی صاحب کے مشورے سے مسجد عالم گیر جالندھر شہر بازار اٹاری میں بہ تاریخ ۱۹ شوال ۱۳۴۹ھ مطابق ۹/ مارچ ۱۹۳۱ کو مدرسے کا افتتاح کیا۔اس کے بعد ۲۳ شعبان ۱۳۵۰ھ کو مولانا احمد بخش صاحب وفات پا گئے اور مولانا محمد علی نے سیاست میں مشغولیت کی وجہ سے مدرسۂ ہذا کی رکنیت اور تمام خدمات سے استعفیٰ دے دیا، اب مدرسے کا تمام انتظام و اہتمام اور تعلیم کا بار تنہا احقر پر پڑ گیا۔اس لیے مدرسے کے مناسب حال حضرات مدرسین کا تقرر عمل میں آیا۔مدرسے میں دورۂ حدیث شریف بھی ہوتا رہا۔تقریباً ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء ملتان شہر میں مدرسہ خیر المدارس کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کیمل پوری اور دیگر حضرات مدرسین کو بلا کر توکلاً علی اللہ مدرسے کا کام شروع کیا گیا۔

تھانہ بھون کی پہلی حاضری شوال ۱۳۴۲ھ مطابق مئی ۱۹۲۴ کو ہوئی، اور پھر یہ سلسلہ آخری حاضری ۱۷ رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۹۴۳ء تک جاری رہا۔حضرت اقدس کا وصال ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ مطابق جولائی ۱۹۴۳ء منگل کو ہوا تھا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔اور اس کے دوسرے دن تھانہ بھون آخری حاضری ہوئی۔پہلی حاضری شوال ۱۳۴۲ھ مئی ۱۹۲۴ کے اوائل میں ہوئی اور ایک ہفتہ قیام رہا۔مقیمین کو اس وقت مکاتبت کی اجازت تھی، چناں چہ پہلا خط لکھ کر اپنا حال عرض کیا گیا تو حضرت والا نے مجھ میں تکبر تشخیص کر کے اس کا علاج شروع فرمایا، میں نے دوسرے خط میں تشخیص و تجویز دونوں کو تسلیم کیا تو حضرت والا نے جواب میں جو الفاظ تحریر فرمائے، وہ اب تک دماغ میں محفوظ ہیں۔فرمایا کہ جی بہت خوش ہوا، هنيئاً لك العلم والعمل۔

پہلی بیعت حضرت مرشدی حافظ محمد صالح صاحب سے ہوئی تھی، اس لیے سیدنا و مرشدنا

حکیم الامت تھانویؒ قدس سرہٗ العزیز نے ابتدا میں بیعت کرنے سے انکار فرمادیا تھا۔ فرمایا کہ سلسلہ قائم ہے، ''ضرورت نہیں''۔ دراصل حضرت اقدس کا یہ اصول تھا کہ ابتدا میں بیعت نہیں فرماتے تھے، بل کہ مناسبت ہونے کے بعد بیعت فرماتے تھے۔ ایک سال کے بعد تجدید بیعت کی درخواست کی گئی تو قبول فرماتے ہوئے فرمایا کہ یہ پرچہ میں اپنے پاس رکھتا ہوں، بعد نماز مغرب خود بلالوں گا۔ چناں چہ مورخہ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ یکم جولائی ۱۹۲۵ء کو بعد نماز مغرب لیلۃ العید الاضحیٰ میں مسجد خانقاہ امدادیہ میں چاروں سلسلوں چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، قادریہ میں بیعت سے دست بہ دست مشرف فرمایا۔ اس روز سے حضرت والا کی طرف سے شفقت اور نظر عطوفت اور ظاہری و باطنی تربیت میں زیادتی اضعافاً مضاعفۃً نمایاں ہونے لگی اور خط و کتابت اور آمد و رفت میں بھی ترقی ہوئی، بل کہ ذوق وشوق روز مرہ ترقی پذیر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میرے ایک عریضے کے جواب میں بہ تاریخ ۱۷ رجب ۱۳۴۷ھ کو بہ وقت قیام احقر درخانقاہ امدادیہ اس خاک پائے اہل اللہ سراپا گناہ کو بیعت و تلقین کی اجازت عطا فرمائی اور یہ الفاظ لکھ کر مجھے اطلاع دی:

> اب کی بار شروع ہی دن سے ذوقاً مجھ کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ آپ پر خدا کا فضل وکرم شروع ہوگیا ہے، جو خواص پر ہوتا ہے اور جن احوال کی مجھ کو احباب سے تمنا ہوتی ہے، ان کی جھلک محسوس ہونے لگی۔ خصوص کل کے دن سے اور اس بنا پر بہ توقع زیادت رسوخ شب سے قلب کا یہ تقاضا تھا کہ آپ کو تلقین و بیعت کی اجازت دے دوں۔ اس رقعے سے میرے خیال کی صحت ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ اس رقعے میں جو حالات آپ نے لکھے ہیں، یہ سب آثار ہیں فنا کے، جو اس طریق کا ایک اعتبار سے اول قدم بھی ہے اور ایک اعتبار سے آخر قدم بھی۔ پس اس خیال کی صحت کے بعد توکلاً علی اللہ اپنے اس تقاضے کو پورا کرتا ہوں اور بہ نام خدا آپ کو بیعت و تلقین کی اجازت دیتا ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس میں برکت ہوگی۔ عذر اور تواضع نہ فرمائیں اور اپنے خاص محبین سے اس کا اظہار بھی فرمادیں اور چوں کہ میں ان واقعات کو اپنی یادداشت میں تحریراً محفوظ بھی رکھتا ہوں، اس لیے مجھ کو اپنا نام پتا ڈاک کا لکھ کر دے دیں، میں اپنے پاس

محفوظ رکھوں گا اور موقع پر شائع کروں گا۔

اشرف علی ۱۷ رجب ۱۳۴۷ھ (انتہی) (۲۸/۱۲/۳۰ء)

میں نے حسب حکم اپنا پتا لکھ کر تو دے دیا، مگر اس اطلاع پر بے انتہا ندامت، بل کہ اس قدر حیرت ہوئی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ حضرت والا نے یہ بارِ گراں میری گردن پر کیسے رکھ دیا۔ میں اس کو برداشت نہیں کرسکوں گا اور مجھے اس کی سمجھ بھی نہیں اور مجھ میں اس کی اہلیت بھی نہیں۔ میں کہاں اور یہ بارِ گراں کہاں۔ میں اپنے خیالات اور تردد ات میں تھا کہ حضرت والا نے خانقاہ امدادیہ کے ترجمان ماہ نامے ''الامداد'' میں اس اجازت کو شائع فرما کر ۱۷ رجب ۱۳۴۷ھ کے والا نامے میں احقر کو اس کی اطلاع فرمادی۔

مدرسہ جامعہ خیر المدارس اکتالیس سال پورے کر چکا تھا اور ۱۵ شعبان ۱۳۹۰ھ سالانہ امتحان ختم ہو چکے تھے اور مدرسہ تعطیلات کے لیے بند ہو گیا۔ بیرونی طلبہ اور اساتذہ کرام اپنے گھروں کو جا رہے تھے کہ ۲۰ شعبان ۱۳۹۰ھ بہ روز پنج شنبہ بانی و متولی، مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا خیر محمد رحمۃ اللہ علیہ پر دل کا جان لیوا دورہ پڑا اور آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سیکڑوں علما اور ہزاروں تلامذہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خیر و برکت اور تعلیمی و تربیت سے محروم ہو گئے۔ قبر مبارک مدرسہ جامعہ خیر المدارس کے احاطے میں واقع ہے۔

مولانا قاری خلیل الرحمٰنؒ

والد ماجد مولانا قاری خلیل الرحمٰنؒ ۱۰ اگست ۱۹۴۳ء مطابق ۲۸ شعبان ۱۳۶۳ھ کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی نام غلام محبوب رکھا گیا، مگر پھر گھر کے قریب والی مسجد میں مقیم ایک درویش صفت فقیر مرسل من جانب اللہ کے مشورے سے یہ نام تبدیل کر کے خلیل الرحمٰن رکھ دیا گیا۔ چوں کہ یہ نام آپ کے دادا مرحوم کا تجویز کردہ تھا، جو علم و فن سے کماحقہٗ آگاہی نہ رکھتے تھے، نیز انتہائی سادہ مزاج اور اپنے خاندان کی مخصوص روایات کے امین بھی تھے، ان کو یہ نام زبان پر ثقیل معلوم ہوا۔ خود اپنی مختصر خود نوشت میں رقم طراز ہیں:

ابتدا میں اگرچہ گھر والوں نے اور اسی طریقے سے خصوصاً دادا مرحوم نے انکار

کیا، کیوں کہ علم کا گزران تک مطلقاً نہ ہوا تھا اور بلا شبہ یہ لفظ ان کے لیے اجنبی اور زبانوں پر ثقیل تھا۔ اس لیے مخالفت میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا، لیکن والد بزرگ وار صوفی واحد بخش رحمۃ اللہ علیہ علم دوست، سلیم الفطرت اور عمدہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان کی طبیعت صحیحہ کو یہ نام بہت عمدہ تھا، اس لیے بادِ مخالف کو پس پشت ڈال کر تو کلاً علی اللہ یہی نام رکھ ہی دیا۔ اور آج تک وہی نام ہے جس کی وجہ سے مسمّی ہوں۔ (۱)

ان دنوں علاقے کا مشہور مدرسہ حنفیہ محمدیہ حسین آگاہی میں واقع تھا، جہاں استاذ القرا قاری رحیم بخش پانی پتیؒ پورے ملتان کو قرآن کے نور سے منور کیے ہوئے تھے۔ ان کے حلقہ درس میں بٹھائے گئے اور یوں ابتدا ہی سے ایسے نابغہ روزگار کی صحبت میسر آئی، جس کے تربیت یافتہ آج بھی چہار دانگِ عالم کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ قاری رحیم بخشؒ کے ساتھ والد محترمؒ کو جو قلبی ارادات اور محبت تھی، اس کا اندازہ اس عبارت کو پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں:

۵ برس کی عمر میں پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ اولاً حضرت العلامہ مولائی و استاذی مخدوم جناب مکرم مولانا قاری و حافظ حاجی رحیم بخش صاحب ابن ملک فتح محمد صاحب ادام اللہ لقاءہٗ وظلہ المبارک علینا نے بسم اللہ کرائی۔ بعدہ مختلف اساتذہ کے پاس پڑھتا رہا، لیکن ہمیشہ حضرت قاری صاحب کے ماتحت ہی رہ کر اساتذہ تبدیل کیے۔ احقر تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتے ہوئے نہیں جھجکتا کہ الحمد للہ میری قرآن کی یادداشت پر حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی خوش تھے۔ (۲)

محض نو برس کی عمر میں حفظ قرآن کی سعادت حاصل ہوئی۔ پھر ایک سال مزید گردان و یادداشت کے لیے لگایا۔ تقسیم ہند کے بعد جب مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مدرسے خیر المدارس کو ملتان لے آئے تو اہل ملتان کو حصول علم کا گویا انتہائی عمدہ وسیلہ میسر آ گیا۔ مدرسہ حنفیہ محمدیہ سمیت دیگر بہت سے چھوٹے چھوٹے مدرسے بھی خیر المدارس سے ملحق ہو گئے۔ یہ غالباً ۵۵-۱۹۵۴ء کا زمانہ تھا، جب قاری رحیم بخشؒ کے مشورے سے آپ کو خیر المدارس کے درجہ کتب میں داخل کروا دیا گیا۔ ابتدائی دو سال فارسی اور خطاطی میں صرف

کیے۔ بعدازاں دیگر کتب کی طرف متوجہ ہوئے۔ ذاتی محنت ولگن اور شوق سے فن خطاطی میں ایسی مہارت حاصل کی کہ سب اساتذہ رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آپ کی خوش خطی کا اندازہ اب بھی مدارس میں پڑھائی جانے والی کتب کریما سعدی اور نام حق کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے۔

شروع میں زبان میں قدرے لکنت تھی، جو تاحیات کسی نہ کسی صورت برقرار رہی، اپنی اس خامی کا ذکر جن دلاویز کلمات سے کرتے ہیں اور پھر خود کو دلاسہ دیتے ہیں، وہ قابلِ مطالعہ ہے:

> خدائے برتر کا ہزار احسان ہے کہ ہر طرح کی خوبیوں سے مزین کیا ہے۔ لیکن زمانے نے کس کو جملہ خوبیوں کا مالک بننے دیا ہے کہ مجھ کو بھی کامل مکمل بننے کی اجازت ملتی۔ جہاں خوبیاں ہیں، وہاں نقصانات بھی جلوہ دکھا رہے ہیں۔ جہاں نقصانات کا ڈیرہ ہے، وہیں فوائد بھی اپنی رونمائی کر رہے ہیں۔ اگر راحت کا گلستان ہے تو اس کے پہلو میں بے آرامی کا خارستان بھی جلوہ گر ہے۔ یہ خدائی اصول ہے کہ سفیدی میں سیاہی کا نقطہ، حسن کی نزہت میں آفرینش کی روح ڈال کر نظروں کو خیرہ کرتا ہے۔ سراسر سفید اور محض سیاہ کو جمال کے ذرے کا مالک نہیں کہا جاسکتا۔ (۳)

مطالعے کے دوران انہماک کا یہ عالم ہوتا کہ اپنے گرد وپیش کی مطلقاً کوئی خبر نہ ہوتی تھی۔ آپ کے پرانے دوست قاری سیف الدین مرحوم نے راقم سے فرمایا تھا کہ جن دنوں آپ کے والد مرحوم عازم سفر حج تھے، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ دوران سفر آپ کے والد ہر وقت کتاب پر جھکے رہتے اور انہیں اپنے اردگرد کی مطلق کوئی خبر نہ ہوتی تھی۔

۱۹۶۱ء مطابق ۱۳۸۱ھ جب آپ کی عمر تقریباً ۱۷ برس محض تھی، فاضل درسِ نظامی ہوئے۔ غالباً مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا عبداللہ درخواستیؒ اور مولانا خیر محمد جالندھریؒ نے آپ کی دستار بندی کی تھی۔ جن دنوں والد بزرگ وار درجہ دورہ حدیث میں تھے، وہی سال وفاق المدارس العربیہ کا پہلا سال تھا۔ حضرت والد علیہ الرحمہ نے بھی وفاق کے امتحان میں شرکت کی اور ۶۰۰ میں سے ۶۰۰ نمبر لے کر ملک بھر میں اول آئے اور ہر ایک کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ان کی اس کامیابی پر ''خدام الدین'' نے مضامین شائع کیے اور کافی پذیرائی

دی۔اسی دوران آپ نے اپنے مربی قاری رحیم بخش مرحوم سے مسجد سراجاں حسین آگاہی میں قرأت سبعہ عشرہ کی تکمیل کی اور پھر ان ہی کے زیر سایہ مشقِ تدریس کرتے رہے۔

والد مرحوم کا فطری میلان تدریسِ کتب کی طرف تھا، نیز اس شعبے میں آپ کی قابلیت بھی مسلمہ تھی اور اساتذۂ کتب کی خواہش بھی یہی تھی۔مگر جب اس بابت آپ قاری رحیم بخش مرحوم سے مشورہ کرنے پہنچے تو قاری صاحبؒ نے فرمایا:

میری خواہش یہ ہے کہ آپ قرآن کے لیے اپنی زندگی وقف کردیں اور اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں۔

نامعلوم کیا کیا خواہشیں دل میں لے کر گئے ہوں گے، نہ جانے کیا کیا ارمان ہوں گے، مگر اِدھر حضرت قاری صاحب کے ذہن سے یہ کلمات نکل رہے ہیں اور اُدھر والد صاحبؒ اپنے ارمانوں کا خون دامن سے صاف کرنے کی بہ جائے مصمم ارادہ اس بات کا کر رہے ہیں کہ ایسا ہی کروں گا۔سبحان اللہ!

پہلے ہم نے سامنے اس گل کے خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا

چناں چہ قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے تدریس قران کے لیے میلسی تشریف لے گئے۔ایک سال تک یہیں رہے، پھر دارالعلوم کبیر والا چلے آئے۔یہیں ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء مطابق ۲۸ شعبان ۱۳۹۱ھ کو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔۱۹۷۲ء میں دارالعلوم کبیر والہ کو ایک ماہ کے نوٹس پر استعفیٰ دے دیا، اور اپنے قریبی رفیق مولانا عبدالمجید لدھیانویؒ کے ہم راہ کہروڑ پکا تشریف لے آئے۔یہاں بھی مزاج کے موافق ماحول میسر نہ آیا، چناں چہ ایک سال بعد ہی رحیم یار خان چلے آئے۔یہیں آپ کی ملاقات مولانا عبدالبر محمد قاسم مدظلہ العالی سے ہوئی، جنہوں نے جامعہ قاسم العلوم (ملتان) میں تدریس کی دعوت دی۔والد مرحوم جو اپنے مخصوص مزاج اور افتادِ طبع کے باعث پہلے ہی تنگ آئے ہوئے تھے، مدرسے کو استعفیٰ پیش کر کے قاسم العلوم ملتان چلے آئے اور تاحیات یہیں مقیم رہے۔غالباً ان ہی دنوں ملتان میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی قائم ہوئی تھی۔یونیورسٹی کے اسٹاف میں شعبۂ عربی کے پروفیسر کی

اسامی خالی تھی۔ آپ کو اس عہدے کی باقاعدہ پیش کش ہوئی۔ باوجود اس کے کہ مشاہرہ مدرسے کی تن خواہ سے تین گناہ زیادہ تھا، والد صاحبؒ نے یہ پیش کش مسترد کردی۔ شاید اس معاملے میں بھی اپنے استادِ مرحوم کا حکم پیشِ نظر رہا ہوگا۔

جن دنوں آپ حصول تعلیم میں کوشاں تھے۔ ان ہی دنوں مولانا شاہ عبدالقادر رائپوریؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔ سلسلہ رائپوری سے تقدس کی حد تک محبت تھی۔ حضرت رائپوریؒ کے انتقال کے بعد ان کے جانشین شاہ عبدالعزیز رائپوریؒ کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ اسی طرح مولانا عبداللہ بہلویؒ اور مولانا عبدالحیی بہلویؒ سے بھی خاص تعلق تھا۔ ان ہی بزرگوں کی صحبت نے دل میں عشقِ نبوی کا طوفان برپا کردیا تھا اور دل ہر وقت حجاز کی فضاؤں میں کھویا رہتا۔ لیکن صرف تصورات ہی سے اس نیک جذبے کی تکمیل نہیں ہوتی، بل کہ اس خواہش کی تسکین کے لیے بھی وسائل کی ضرورت درکار ہوتی ہے اور وہ نہ ہونے کے برابر تھے۔

کہتے ہیں کہ جذبات صادق ہوں تو ضرور شرمندۂ تعبیر ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت بھی حالات نامساعد اور مسائل گھیرے ہوئے تھے، لیکن وہ جس کی حاضری اپنی بارگاہ میں قبول کرلے، اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ ۱۹۸۷ء میں حکومت کی ایک اسکیم کے تحت آپ کو ویزا مل گیا۔ کجا کہ دل تمناؤں سے معمور محض تھا، کجا آج ان تمناؤں کی تکمیل کا دن آپہنچا۔ چناں چہ بحری جہاز سے حجاز تشریف لے گئے۔ سفر سے پہلے ڈر تھا کہ نامعلوم وہاں قیام وطعام کے سلسلے میں کیا کیا مشکلات پیش آئیں گی۔ مگر جوں ہی سعودیہ پہنچے تو حیران رہ گئے کہ شاگردوں کی قطار خدمت کے لیے کھڑی ہے، ہر ایک خندہ پیشانی سے خود کو خدمت کے لیے پیش کرتا ہے۔ چناں چہ اللہ نے ایک بڑی مشکل حل کردی اور آپ خشوع وخضوع سے عبادت الٰہی میں مستغرق ہوگئے۔ ان ہی دنوں آپ کو آں حضرت ﷺ کی زیارتِ مبارکہ خواب میں ہوئی تھی۔

اے آتش فراقت دل ہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جاں ہا خراب کردہ

طبیعت میں حد درجہ استغنا تھا۔ مل گیا تو شکر کیا، نہ ملا تو کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ پرتکلف غذا پسند نہیں فرماتے تھے، اسی طرح پرتکلف لباس بھی نہ پہنتے تھے۔ مگر اس کے

باوجود صفائی پسند اور خوش خوراک واقع ہوئے تھے، رہن سہن اور بول چال سے نفاست ٹپکتی تھی۔ فطرتاً کم گو تھے، مگر جو بات کرتے انتہائی صائب اور حتمی کرتے، یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ ان کی بات پتھر پر لکیر ہوتی اور کسی کو اس پر انگلی رکھنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اگرچہ اپنے معاشی حالات خاطر خواہ نہ تھے، لیکن پھر بھی مستحقین کو مایوس نہ لٹاتے تھے۔ بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ آپ کی مساعی جلیلہ سے بہت سے نادار والدین اپنی بچیوں کے بوجھ سے سبک دوش ہوئے اور بہت سے گھروں میں ایندھن جلا۔ اس سلسلے میں کبھی ریا سے کام نہ لیتے تھے اور ہمیشہ پوشیدہ رہ کر یہ خدمات بہ جالاتے۔

علم طب آپ کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اس موضوع پر آپ کی مہارت کا بین ثبوت آپ کی وہ بیاضیں ہیں، جو آپ نے اپنے پیچھے چھوڑی ہیں۔ اس کے علاوہ فنِ قرات پر بھی چند غیر مطبوعہ عربی رسائل ہیں، جو آپ کی علمیت اور قابلیت کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ اسی طرح علم الکلام کی مشہور مگر دقیق کتاب ''نہایۃ الکلام فی علم الکلام'' کا ترجمہ ایک دوست کی فرمائش پر محض دس روز میں کر دیا تھا۔ مولانا خیر محمد جالندھریؒ کی تقریر بخاری کو نہایت حزم و احتیاط سے قلم بند کیا۔ یہ واحد تقریر ہے، جس پر مولانا خیر محمد جالندھریؒ کو اعتماد تھا۔ شعر و شاعری کا بھی عمدہ ذوق پایا تھا اور کئی اشعار کہے ہیں، جو قلمی بیاضوں میں محفوظ ہیں۔ ابتدا میں طبیعت لکھنے لکھانے کی طرف کافی راغب تھی، مگر پھر قرآن مجید کی تدریسِ پیہم نے اس شوق کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔

والد مرحوم کو شوگر کا عارضہ لاحق تھا، جس نے انہیں نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہر طرح کا علاج معالجہ کروایا، مگر!

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

شروع میں بائیں ہاتھ پر فالج کا حملہ ہوا، جس نے عضلات کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، لیکن اس جان لیوا حملے کا مقابلہ بھی آپ نے انتہائی صبر و تحمل سے کیا، جس کے نتیجے میں جلد ہی اس کے اثرات زائل ہونا شروع ہو گئے اور طبیعت صحت کی طرف مائل ہونا شروع ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد ہی ڈاکٹروں نے پھیپھڑوں میں پانی کی پیشین گوئی کر دی، نیز یہ بھی کہا کہ گردوں میں بھی کچھ مسئلہ ہے۔ سال بھر ان بیماریوں میں مبتلا رہے۔ اس عرصے میں ان بیماریوں کا انتہائی بے

جگری سے مقابلہ کیا اور اپنے معمولات میں سرِ مو فرق نہ آنے دیا۔ راقم حیران ہے کہ شروع بیماری سے لے کر تادم آخر قرآن کی تلاوت متواتر کرتے رہے۔ حالت یہ ہوتی کہ اٹھنا تو در کنار بولے ہوئے الفاظ کی ٹھیک سے سمجھ نہ آپاتی تھی، مگر زبان تھی کہ اس حال میں بھی ہر وقت کلام الٰہی سے تر رہتی۔ ان نامساعد حالات میں بھی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات اس ناچیز کو حکم ہوتا کہ مجھے کچھ سناؤ، راقم پڑھتا جاتا اور حضرت آنکھیں موندے نیند کی سی کیفیت میں لیٹے رہتے۔ ادھر مجھ سے غفلت ہوئی، ادھر آنکھیں پٹ سے کھل گئیں، مسکرا کر فرماتے غلطی کر رہے ہو۔

غالباً ربیع الاول کی ابتدا تھی، جب ہسپتال لے جانا پڑا۔ اس تمام عرصے میں آپ حالتِ استغراق میں رہے۔ گیارہ ربیع الاول کو کافی عرصے بعد اطمینان سے کھانا تناول فرمایا، اور چہرے پر بشاشت کے آثار نمودار ہوئے۔ اسی دوران گفت گو بھی فرماتے رہے، جو زیادہ تر نصائح پر مشتمل تھی۔ رات کو خلافِ دستور جلد سو گئے۔ ۱۲ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ مطابق ۱۵ مئی ۲۰۰۳ء کو فجر کی اذان کے وقت آپ کی طرف نظر کی تو پرسکون تھے، کچھ دیر بعد بھی یہی حالت رہی تو راقم کو تشویش ہوئی۔ چناں چہ جسم کو ہلایا جلایا تو محسوس ہوا کہ جانِ عزیز جان آفریں کے سپرد کر چکے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ والد بزرگ وار کو قبر کے لیے جو جگہ میسر آئی، وہ عین ان کی والدہ کے قدموں تلے ہے۔ یوں اللہ نے دنیا ہی میں اپنے ایک نیک بندے کا حال لوگوں کو دکھا دیا۔

مقدمہ الامالی لجامع صحیح البخاری

بدیہی امر ہے کہ وجود بہ مقابلہ عدم محض خیر ہے اور عدم محض شر ہے۔ اس لیے کہ ایجاد صفت باری ہے تو ایجاد کا متعلق خواہ اشرار ہوں، ایک کمال کی چیز ہے، تو یہ کمالِ الٰہی کی دلیل ہے، کیوں کہ ناقص اس ایجاد سے عاجز ہے۔ تو پہلی نعمتِ عظیم انسان کے لیے وجود ہے۔ اسی وجہ سے قرآن میں خلق انسان کو کئی بار تقسیم کر کے بیان کیا گیا اور بہت سی تاکیدات لائی گئیں۔ ایسے ہی انسان کا وجود دیگر اشیا کے لیے بھی نعمت ہے، کیوں کہ دیگر اشیا کو انسان کا تابع کر کے پیدا کیا گیا ہے۔

ابلیس کو مغالطہ ہوا، اسی لیے اس نے انسان کی فضیلت کا اقرار نہ کیا۔ اس نے سمجھا کہ انسان عناصرِ اربعہ (آگ، مٹی، پانی، ہوا) سے مرکب ہے اور یہ سفلیات ہیں۔ اس لیے اس نے انسان کو مفضول سمجھا۔ فی الحقیقت اس نے غلط سمجھا، انسان قالب مع روح کا نام ہے اور روح ہی درحقیقت بلندی اور عظمت والی ہے۔ وہی حقیقت انسانی ہے، جسم محض دنیا میں آنے کا ایک آلہ ہے۔ تو جب انسان کی حقیقت روح ہوئی تو اب روح اور آگ کا مقابلہ کرنا چاہیے کہ کون سی چیز بلند ہے؟ تو مشاہداتی لحاظ سے روح بلند ہے۔ چناں چہ اس قانون کے لحاظ سے جو ابلیس نے کیا تھا، انسان افضل ثابت ہوا۔ اس لیے کہ مقامِ روح بلند ہے۔

دوسری بات یہ کہ انسان کا ظاہری بدن عناصرِ اربعہ متضادہ سے بنا ہوا ہے، کیوں کہ دو عنصر (آگ اور ہوا) بلندی کو اور دو عنصر (مٹی اور پانی) پستی کو چاہتے ہیں۔ دو رطوبت والے ہیں اور دو خشکی والے۔ نیز یہ سب متضاد ہیں۔ صوفیہ کے نزدیک تضاد حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ زمین میں ہر شے قبض کرنے کا مادہ موجود ہے اور یہ خاصیت بخل ہے۔ چناں چہ بخیل آدمی کی یہی مثال ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں جانے دیتا، جیسا کہ زمین کوئی چیز نہیں چھوڑتی اور ہر شے قبض کر لیتی ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ انسان فطرت کے اعتبار سے بخیل بلا کسب کے ہے۔

دوسرا عنصر پانی ہے، اس میں خاصیت عدم قناعت کی ہے کہ اردگرد کو پھیل جاتا ہے اور دوسرے کے حق پر قابض ہو جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ پانی میں حرص کا مادہ پایا جاتا ہے۔ چناں چہ انسان میں فطرتاً حرص موجود ہے۔

تیسرا عنصر ہوا ہے اور یہ بھی نعمت ہے جو کہ حیاتِ انسانی کے لیے بہت ضروری ہے۔ اللہ نے اسے اتنا ارزاں کیا کہ اس کی قیمت کوئی نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی حد بندی اور نہ اس کی کسی نے تقسیم کی ہے اور جتنی غیر ضروری اشیا ہیں، ان کو اللہ نے گراں اور نایاب کر دیا، مگر ہوا میں بھی ایک نقص ہے کہ اس میں خود پسندی موجود ہے۔ چناں چہ انسان بھی فطرتاً شہرت پسند واقع ہوا ہے۔

چوتھا عنصر آگ ہے یہ اوپر کو جاتی ہے، یہ صفت کبر ہے کہ دوسرے میرے سامنے حقیر رہیں۔ تو انسان میں بھی کبر، جو کہ روح کے نقصان کا باعث ہے، موجود ہے۔ چناں چہ ان

نقصانات کو رفع کرنے کے لیے انبیا علیہم السلام کو مبعوث فرمایا کہ بخل فلاں چیز میں اور حرص فلاں چیز میں موجود ہے، تاکہ فطرت کے مطابق روح کی ترقی ہو۔ بہ ہر حال انسان میں عناصرِ متضادہ موجود ہیں، اس کو کوئی غیر کاری گر نہیں جوڑ سکتا۔ تو معلوم ہوا کہ انسان کا وجود عرفانِ الٰہی کا سبب اور کمالاتِ الٰہی کا مظہر تھا، اس لیے سب سے افضل ٹھہرا اور ابلیس کی نظر اس طرف نہ ہوئی۔

اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ انسان کی احتیاجات تمام مخلوقات سے زیادہ ہیں اور جو محتاج زیادہ ہو، اس کا رتبہ بھی اسفل یعنی سب سے نچلا ہونا چاہیے، تو اس سے تو انسان کا غیر افضل ہونا ثابت ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ احتیاجات نقص کی دلیل نہیں، بل کہ بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ کبھی رتبے کی زیادتی کی وجہ سے حفاظت کی زیادہ اہمیت کی جاتی ہے۔ تو انسان کو چوں کہ الٰہی راز داری نصیب ہوئی تھی، اس لیے اس کی حفاظت زیادہ محتاج بنا کر کے کی، کیوں کہ اگر محتاج نہ ہوتا تو کہیں خدائی دعوے دار نہ بن بیٹھتا۔ چناں چہ دنیا میں ایسا ہی ہوا کہ جس کو عزت و شہرت اور مال و دولت سے نوازا، وہ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا، جیسا کہ فرعون۔ چناں چہ قرآن میں ہے کہ سب سے پہلے مال دار لوگ منکر ہوں گے۔ لہٰذا احتیاجات کا انسان پر لگانا، اس کی غایت حفاظت ہے کہ انسان خدائی دعوے سے باز رہے تو احتیاجات عیب کے لیے نہیں ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ انسان کا وجود نعمتِ عظمیٰ ہے اور درجہ متبوعیت رکھتا ہے۔ چناں چہ حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہوا کہ جیسے انسان پر ہم نے دنیا میں رحمت کی ہے، ایسے ہی آخرت میں بھی محروم نہ رکھا جائے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا فرمائی جو کہ بُرے کاموں سے روکتی ہے، کیوں کہ عقل کے معنی روکنے کے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کو مبعوث فرمایا کہ انسان کو مرضیاتِ الٰہی بتائیں۔ چناں چہ مرضیاتِ الٰہی کا حاصل کرنا ضروری ہے، کیوں کہ یہ رحمتِ اخروی کا ذریعہ ہے اور مرضیاتِ الٰہی معلوم ہوتی ہیں حدیثِ رسول ﷺ سے، اس لیے معلوم ہوا کہ علمِ حدیث نہایت ضروری ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اس کو بہت دخل ہے۔

علمِ حدیث کا معنی و مفہوم

حدیث کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

هو علم يعرف به اقوال رسول الله ﷺ و افعاله و احواله (۴)

علم حدیث وہ علم ہے جس میں نبی کریم ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال سے بحث کی جاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کا چناؤ کریں، وہ غلط نہیں ہوتی، کیوں کہ وہ علیم و خبیر ہے اور انبیا علیہم السلام منتخب شدہ ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۵)

بے شک اللہ نے پسند کیا آدم کو، نوح کو، ابراہیم کے گھر کو اور عمران کے گھر کو سارے جہان سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کسبی نہیں، بل کہ وہبی ہے۔ نہ کہ جیسا مرزا غلام احمد قادیانی سمجھا کہ جیسے صدیقیت و صالحیت کا دروازہ بند نہیں، نبوت بھی بند نہیں ہے۔ لیکن آیتِ مذکور سے ثابت ہو گیا کہ نبوت وہبی ہے۔ تو جب انبیا علیہم السلام میں عصمت لازم ہے تو ان کے اقوال و افعال و احوال بھی ذی عصمت ہوں گے، اس لیے علمِ حدیث تمام اشیا کا نام ہوگا۔ بعض محدثین نے توسیع کی ہے کہ بے شک عصمت انبیا میں محضر ہے، مگر صحابہ میں بھی شمہ عصمت موجود ہے، اس لیے کہ صحابہ کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ (۶)

اللہ نے تمہارے دل میں ایمان کی محبت ڈال دی اور تمہارے دلوں کو اس سے مزین کیا اور نفرت ڈال دی تمہارے دل میں کفر، فسوق اور نافرمانی کی۔ یہی لوگ سیدھی راہ پر ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ ان میں بھی عصمت موجود ہے۔ لیکن وہ عصمت یہ ہے کہ کبائر سے

اجتناب اور توبہ بعد از ارتکاب، یعنی وہ گناہ پر قائم نہیں رہتے۔ قرآن میں آیا ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۷)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، سخت ہیں کافروں پر اور نرم ہیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ۔

لفظ ''معہ'' کے استعمال کے لیے دوام شرط ہے اور معیت مزاج شناس بنا دیتی ہے اور یہی چیز ان کو گناہ سے باز رکھتی ہے۔ نیز قرآن میں صحابہ کی متبوعیت کے حوالے سے ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (۸)

اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے نیکی کے ساتھ۔ اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے۔

اسی طرح قرآن میں ارشاد ہے:

اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۹)

اور ان ہی کے لیے ہیں خوبیاں اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے۔

اس لیے بعض محدثین نے توسیع کر کے صحابہ کرامؓ کو بھی اس تعریف میں شامل کیا ہے اور بعض محدثین نے تو تابعین کو بھی شامل کیا ہے۔ (۱۰) کیوں کہ ان کا ذکر بھی بالعطف ہے۔ تو ان کے لیے بھی شمہ عصمت ان کو ممتاز کرتا ہے۔ اس لیے ان کا قول و فعل بھی قابلِ عمل رکھا۔ تو ان کے نزدیک تینوں کے قول کو حدیث کہیں گے۔ جمہور کا مذہب یہی ہے اور پہلی اصل تعریف ہے، جب کہ صحابہ و تابعین کے اقوال کو اثر کہیں گے۔

علم حدیث کا موضوع اور غرض و غایت

علم حدیث کا موضوع اللہ کے رسول کی حیثیت سے آپ ﷺ کی ذات مبارکہ ہے۔ چناں چہ چالیس سال کی زندگی کے بعد والے اقوال و افعال کو حدیث کہیں گے۔ اس لیے قرآن کریم نے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (۱۱) بیان کیا ہے، ''اذ ولد'' نہیں بیان کیا گیا۔ یہ موضوع ہے جمہور کی تعریف کی بنیاد پر اور جنہوں نے صحابہ و تابعین کے اقوال و افعال کو بھی حدیث کی تعریف میں داخل کیا ہے، ان کے نزدیک

صحابہ کرام اور تابعین کی ذاتِ مبارکہ بھی اس میں شامل ہوگی۔ علم حدیث کی غرض وغایت یہ ہے کہ اس سے دونوں جہانوں کی سعادت حاصل کی جائے، چناں چہ اس کی تعریف یوں کریں گے۔

علم حدیث کی فضیلت کی وجوہات

☆ یہ مرضیاتِ الٰہی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، جو فوز وسعادتِ دارین کا واسطہ ہے۔

☆ نبی کریم ﷺ نے اس کی اشاعت کا حکم فرمایا ہے:

نضر الله امرأ سمع مقالتی فوعاها وحفظها وبلغها (۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ فضیلت کی چیز ہے، کیوں کہ دیگر علوم کے متعلق یہ تاکید حضور ﷺ نے نہیں فرمائی۔

☆ تلاوتِ حدیث کثرت صلوٰۃ علی النبی کا ذریعہ ہے اور کثرت صلوٰۃ قرب الٰہی ونبوی کا ذریعہ ہے، کیوں کہ ایک دفعہ پڑھنے والے پر دس رحمتیں ہوتی ہیں۔

☆ علمِ حدیث کی تعلیم وتعلم تحفظِ دین کا ذریعہ ہے۔ اس لیے کہ دین اسلام کی بنیاد حضور اقدس ﷺ کی ذات اِطہر ہے۔ چناں چہ آپ کے اقوال وافعال واحوال کی حفاظت دین کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔

☆ حضور اکرم ﷺ نے محدثین کو اپنا جانشین بتایا اور ان کے لیے دعا فرمائی ہے۔

علم حدیث افضل ہے یا علم تفسیر؟

علمِ حدیث تمام علوم سے افضل ہے، مگر ایک وقت میں علمِ حدیث اور علمِ تفسیر میں اختلاف ہوا ہے کہ کون سا علم افضل ہے؟ جمہور کے نزدیک علم حدیث افضل ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ علمِ حدیث کا موضوع رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ ہے، جب کہ علم تفسیر کا موضوع کلامِ لفظی ہے اور کلام لفظی بھی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے اور تمام مخلوقات سے افضل حضور ﷺ ہیں اور مدارِ افضلیت موضوع ہوتا ہے۔ تو جب علمِ حدیث کا موضوع افضل ہے تو علمِ حدیث بھی افضل ہوا۔

جب کہ شرذمہ قلیلہ نے کہا کہ علمِ تفسیر افضل ہے، کیوں کہ علم تفسیر کا موضوع کلامِ لفظی ہے۔ مگر یہ کلام نفسی پر دال ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک ہے اور صفات باری قدیم ہیں۔ لہٰذا مخلوق سے اس کو فضیلت ہوئی۔ اس پر جمہور نے اعتراض کیا کہ کلام لفظی مرتب ہونے کی وجہ سے حادث ہے اور حادث قدیم نہیں ہوتا، لہٰذا یہ صفت باری نہ ہوگی۔ تو اس کا جواب شرذمہ قلیلہ کی جانب سے یہ دیا گیا کہ ہم نہیں مانتے کہ ترتیب حدوث کا تقاضا کرتی ہے، کیوں کہ صفاتِ باری میں بھی ترتیب ہے، حال آں کہ وہ حادث نہیں، کیوں کہ ان میں تقدم وتاخر ذاتی ہے اور تقدم اور تاخر ذاتی حدوث کو مستلزم نہیں ہوتا، بل کہ تقدم وتاخر زمانی ہوتا ہے۔

امام احمد بن حنبل (۱۶۴ھ۔۲۴۱ھ) کی نظر اس کی طرف ہوئی اور انہوں نے کہا کہ کلام اللہ غیر مخلوق ہے۔ (۱۳) اس لیے کہ وہ سمجھے کہ دال مدلول کے حکم میں ہوتا ہے۔ جمہور کہتے ہیں کہ اگر دال اور مدلول کو ایک حکم دے دیا جائے تو مخلوق مخلوق نہ رہے گی، بل کہ خالق کے مرتبے پر پہنچ جائے گی۔ کیوں کہ عالم اللہ پر دال ہے تو دال ہونے کی وجہ سے یہ بھی اللہ ہوگا۔ اس لیے ہر دال کو مدلول کے حکم میں نہیں ماننا چاہیے۔ ایسے ہی کلام لفظی بھی (جو دال ہے) اس کو کلام نفسی (جو مدلول ہے) کا حکم نہ دینا چاہیے، بل کہ بعض احکام میں اس کو مدلول کا حکم دیا جائے گا کہ دال کا پڑھنے والا کلام اللہ کا پڑھنے والا ہوگا اور جو اس کا منکر ہوگا، وہ بالاصل کلامِ نفسی کا منکر ہوگا۔

الغرض جمہور کا مذہب راجح ہوا۔ علم حدیث کا یہ مقابلہ اس علمِ تفسیر سے ہے، جو افراط و تفریط سے پاک ہو اور آج کل کی تفاسیر جو مروّج ہیں، ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ شرذمہ قلیلہ بھی انہیں علم حدیث سے کم درجہ مانتے ہیں، کیوں کہ ان میں موضوعات اور اسرائیلیات داخل کی گئی ہیں۔ اصل تفسیر وہ ہے، جس میں اظہار مرادِ خداوندی ہو، جب کہ ان مذکورہ تفاسیر میں تو تخیلات کا مجموعہ رکھا گیا ہے، بل کہ بعض تفاسیر ایسی ملیں گی، جن کو ملاحدہ و کفار نے تصنیف کیا ہے۔ اس لیے مقابلے میں علم التفسیر سے صرف ونحو بھی افضل ہیں۔

چناں چہ ابن جریر طبری (۲۲۴ھ۔۳۱۰ھ) نے تفسیر صحیح کا مدار چار چیزیں بتائی ہیں:

ا۔ تفسیر القرآن بالقرآن وتفسیر القرآن بالحدیث المشہورۃ

۲۔تفسیر القرآن بافعال الصحابۃ رضی اللہ عنہم اجمعین
۳۔تفسیر القرآن باجماع الامہ
۴۔تفسیر القرآن بقواعد العربیۃ المشہورۃ۔(۱۴)

علامہ جلال الدین سیوطی (۸۴۹ھ۔۹۱۱ھ) نے ''الاتقان'' میں لکھا ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے یا حدیث رسول اللہ ﷺ یا اقوال صحابہ یا اجماع امت سے یا قواعد عربیہ مشہورہ سے کی جائے، صحیح تفسیر اسی معیار پر ہوگی، ان کے علاوہ جو ہوگی، وہ تفسیر نہ ہوگی۔ چناں چہ اگر آج کل کے محاورے کے اعتبار سے تفسیر کی جائے تو وہ صحیح نہ ہوگی۔ جب کہ نواب صدیق حسن خاں نے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۱۵) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس سے تجدید نکاح ثابت نہیں، وہ ایک سے نہیں، غیر محدود نکاح کو جائز سمجھتے ہیں۔(۱۶) جیسا کہ فوجی محاورہ ہے کہ اگر کسی کو کہا جائے کہ دو دو ہو کر داخل ہو جاؤ تو اس سے صرف دو کا دخول مقصد نہیں، بل کہ غیر محدود تعداد ہے۔ اس کو تفسیر بالرائے کہا جائے گا۔ کیوں کہ یہ قواعدِ عربیہ مشہورہ کے خلاف ہے اور ایسے ہی اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ (۱۷) اور وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ (۱۸) کی تفسیرِ جدیدہ مردود ہوگی۔

آداب علم حدیث

☆ صحیح نیت یعنی رضائے الٰہی کے امور معلوم کر کے آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کی نیت ہو۔(۱۹) دنیاوی اغراض پیش نظر نہ ہوں۔ اگر تصحیح نیت نہ ہوگی تو عند اللہ کوئی قدر نہ ہوگی۔ جیسا کہ مسجد ضرار کو باوجود عبادت گاہ ہونے کے گرا دیا گیا، کیوں کہ اس کے بنانے میں تصحیح نیت نہ ہونے کی وجہ سے اسے کذب سے تعبیر کیا گیا۔ اسی طرح معاملہ کعب ابن مالک ہے کہ غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے، مگر نیت درست تھی، عمل میں غلطی تھی۔ اس واسطے معاف فرمادیا۔

☆ اساتذۂ حدیث کو اپنی منفعت کے اعتبار سے راجح سمجھنا اور ایک کو دوسرے سے افضل یا کم تر سمجھنا جائز نہیں، بل کہ حسنِ ظن رکھے کہ یہ اچھا ہے، یہاں تک کہ کسی کو ولی اللہ اعتقاد رکھنا بھی جائز نہیں۔ مگر مربی سمجھنا جائز ہے کہ یہ فنِ تصوف یا تعلیم میں ماہر ہے، یہی وجہ

ہے کہ مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۸۲۹ء۔۱۹۰۵ء) سے جب دریافت کیا گیا کہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۹ء) اور جنید بغدادیؒ میں سے کسے زیادہ فائدہ رساں سمجھتے ہیں؟ تو فرمایا کہ جنیدؒ کی طرف تو منہ بھی نہ کروں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا اعتقاد افضلیت کا تھا، بل کہ وہ حاجی صاحبؒ کو زیادہ فائدہ رساں سمجھتے تھے۔

☆ اساتذۂ حدیث سے تعظیم کا معاملہ کرے۔(۲۰)

☆ اپنے دین کے معاملے میں اپنے اساتذہ سے مستقل مشورہ کرتا رہے۔

☆ کم درجے کے استاد سے کسب علم میں حیا نہ کرے۔ جیسے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی مشاورت کو حضرت عمرؓ نے قبول فرمایا۔

☆ استعانت من اللہ، یعنی اپنی قوت پر آدمی بھروسا نہ کرے اور ہر حال میں خدا ہی سے مدد طلب کرے۔

☆ اپنے علم کے موافق عمل حاصل کرتا جائے، کیوں کہ علم مع عمل آگے ترقی کا ذریعہ ہے۔(۲۱)

☆ غرور نہ ہو، کیوں کہ مغرور اور متکبر دونوں علم سے محروم رہتے ہیں۔

☆ کتب حدیث کو باوضو پڑھنا چاہیے۔

☆ ہر وقت نام ''محمد'' صلی اللہ علیہ وسلم آنے پر صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا جائے، یہ باعثِ برکت ہے۔

☆ صحابہ کرام کے نام پر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور تابعی کے نام پر رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ وعنہم کہے۔ صحابی کے ساتھ تابعی وغیرہ سب شامل ہو جائیں گے۔

ضبط حدیث کے طریقے

ضبط دو قسم پر ہے۔ ضبطِ صدر اور ضبط کتاب۔

ضبط صدر یہ ہے کہ حدیث کو سن کر دل میں بٹھایا جائے اور اس کی حفاظت کی کوشش کی جائے۔ لیکن اگر لکھ لے اور لکھے ہوئے کو محفوظ رکھے تو بھی درست ہے، تا کہ بہ وقتِ ضرورت آگے پہنچا سکے۔ اس کو ضبطِ کتاب کہتے ہیں۔ ضبطِ صدر تب ہوگا، جب کہ حافظہ قوی ہو، ورنہ

ضبط مشکل ہوگا۔ صحابہ کرامؓ کے حافظے اچھے تھے، اس لیے لکھنے کا رواج نہ تھا۔ اس کے بعد چوں کہ حفظ میں کم زوری آگئی، چناں چہ دین کو ضبطِ کتاب کرنے کی کوشش کی گئی۔

ضبطِ حدیث سے پہلے ضبطِ صدر کا طریقہ تھا، لیکن جب اس میں کوتاہی ہوئی تو ضبطِ کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ضبطِ کتابت کی دو اقسام ہیں:

☆ مطلق کتابت، یعنی جو حدیث سنی لکھ لی۔

☆ کتابت بہ صورت رسائل و کتب۔

مطلق کتابت میں اختلاف ہے کہ یہ جائز ہے یا مکروہ ہے۔ علما کا ایک گروہ قائل ہے کہ یہ مکروہ ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے صحیح مسلم میں روایت ہے:

قال لا تکتبوا عنی، ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحه (۲۲)

آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے سن کر کچھ نہ لکھو اور جس کسی نے قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز مجھ سے سن کر لکھی ہو، وہ اسے مٹا دے۔

معلوم ہوا کہ کتابتِ حدیث جائز نہیں، لیکن جمہور کے نزدیک کتابت جائز، بل کہ مستحسن و مستحب ہے۔ اس لیے کہ یہ ضبطِ دین کا ذریعہ ہے اور حضور ﷺ سے قولاً و فعلاً ثابت ہے۔ ابو سعید خدریؓ نے جب آپ ﷺ سے روایتِ حدیث کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:

نعم تحدثوا عنی ولا حرج (۲۳)

ہاں! مجھ سے بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔

عبد اللہ ابن عمروؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کتابتِ حدیث کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اکتب فوالذی نفسی بیده ما یخرج منه الا حق (۲۴)

لکھو! اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس زبان سے صرف حق ہی نکلتا ہے۔

اسی طرح ۸ھ میں جب آپ نے خطبہ دیا تو اہلِ یمن میں سے ابی شاہؓ نے درخواست کی:

یا رسول اللہ اکتبوا لی

تو فرمایا:

اکتبوا لا بی شاہ (۲۵)

معلوم ہوا کہ آپ نے حدیث لکھنا جائز رکھا۔ صحابہؓ میں بھی لکھنے کا رواج تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ احادیث کسی کو یاد نہیں

الا ما کان من عبداللہ بابن عمرو فانہٗ کان یکتب ولا اکتب (۲۶)

یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا احادیث میں تعارض معلوم ہوتا ہے، اس کی کوئی تطبیق ہونی چاہیے۔ تو اس کے دو جوابات ہیں:

☆ پہلا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کتابت کا ان کو حکم دیا، جن کے حافظے پر اعتماد تھا اور جن کے حافظے پر اعتماد نہیں تھا، انہیں روک دیا۔ تو ایسی صورت میں دونوں قسم کا ضبط ثابت ہو گیا۔

☆ دوسرا جواب یہ ہے کہ وہ زمانہ نزولِ وحی کا تھا اور قرآن کو بالانصرام لکھوایا جاتا تھا۔ اس لیے خوف تھا کہ قرآن اور حدیث خلط ملط نہ ہو جائیں۔ چناں چہ جن پر ان دونوں کو خلط ملط کرنے کا شبہ نہ تھا، انہیں اجازت دے دی۔

طبقات محدثین

طبقہ اولیٰ: سب سے اول بالاتفاق خلیفۃ المؤمنین حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں تصنیف کا کام شروع ہوا۔ ان کے حکم سے جمہور کہتے ہیں کہ سب سے پہلے امام محمد بن مسلم بن شہاب الزہری (۵۸ھ۔۱۲۴ھ) کو خلیفہ نے حکم دیا تھا اور راجح یہی ہے۔ بعض نے کہا کہ محمد بن عمرو بن حزم کو حکم دیا تھا۔

طبقہ ثانیہ: میں مشاہیر محدثین ہیں۔ بصرہ میں ربیع بن الصبیح اور مدینہ منورہ میں مالک بن انس اور مکہ معظمہ میں عبدالملک بن جریج اور شام میں عبدالرحمٰن اوزاعی اور کوفے میں سفیان ثوری ہیں۔

طبقہ ثالثہ: میں اکثر رواج مسندات کے لکھنے کا تھا۔ مسند وہ ہے جس میں اساتذہ یا ترتیب رتبی صحابہ یا بہ اعتبار ہجرت یا بہ اعتبار حروف تہجی احادیث ذکر کی گئی ہوں اور مسائل کا

اعتبار نہ کیا گیا ہو۔ ان میں سے امام احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن ابراہیم بن راہویہ، نعمان ابن ابی شیبہ ہیں۔ مگر انہوں نے مرفوع وموقوف احادیث میں امتیاز نہ کیا تھا۔

طبقۂ رابع: جس میں سب سے پہلے امام محمد بن اسماعیل بخاری ہیں۔ جنہوں نے مرفوع کو مقطوع سے ممتاز کیا اور چند شرائط سے بخاری شریف کو جمع کیا کہ اس میں تمام احادیث مرفوع ہوں گی، مگر شاہداً اقوال بھی ہوں گیں۔ پھر ان کے تلامذہ نے تصانیف شروع کیں۔

اشاعت حدیث

یعنی کن کن ملکوں میں علم حدیث کا رواج رہا اور ہمارے ملک میں حدیث کیسے پہنچی؟ سب سے پہلے حدیث کے درس وتدریس کا مرجع حجاز تھا، کیوں کہ اس کی ابتدا عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں ہوئی اور وہ حجاز میں تھے۔ پھر اشاعت عراق میں اور بعد ازاں دوسری صدی سے لے کر چھٹی صدی تک خراسان میں ہوئی۔ پھر فتنہ تاتاریہ میں دینی کتابوں کو تاراج کیا گیا اور ایک بڑا ذخیرہ کتب حدیث کا ضائع کیا گیا۔ بعد ازاں کچھ علما ہجرت کر کے شام میں آئے اور شام علم حدیث کا مرجع بنا۔ حتیٰ کہ نویں صدی گزر گئی، مگر ہندوستان اس سے اس وقت تک خالی تھا، اس میں فلسفے ومنطق کا رواج تھا۔ اس کے بعد اللہ نے کچھ ایسے لوگ پیدا کیے، جنہوں نے دور دراز کا سفر کر کے علم حدیث حاصل کیا اور ہندوستان میں اس کا رواج شروع ہوا۔ مگر اس زمانے میں ہندوستانی علم حدیث سے مانوس نہ ہوئے تھے اور علما کو موقع بھی بہت کم ملا تھا۔ پہلے شیخ محمد طاہر گجراتی ثم فتنی مصنف ''مجمع البحار'' ہیں۔ دوسرے عبدالوہاب برہان پوری ہیں۔ تیسرے عبدالاول جونپوری (۱۴۴۳ء۔ ۱۵۰۵ء) مصنف ''فیض الباری'' ہیں۔ چوتھے شیخ علی متقی الہندی (۱۴۷۲ء۔ ۱۵۶۷ء) مصنف ''کنز العمال'' ہیں۔ پانچویں ان میں سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۵۵۱ء۔ ۱۶۴۲ء) ہیں، ان کا زمانہ گیارہویں صدی ہجری کا ہے۔ ان سب علما نے حجاز سے علم حدیث حاصل کیا، مگر ان میں سے اکثر علما واپس آ کر خدمات سرانجام نہ دے سکے اور ان کی وفات کے بعد ہندوستان پھر خالی ہو گیا۔

پھر امام شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم (۱۷۰۳ء۔ ۱۷۶۲ء) نے اس علم کو فروغ دیا۔ سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا اور چودہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ سولہ سال کی عمر میں

تصوف میں بھی ماہر ہو گئے تھے۔ پھر علم حدیث حاصل کرنے کے لیے حجاز تشریف لے گئے اور شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی شافعی کی خدمت میں پہنچ کر فن حدیث حاصل کیا۔ مگر چوں کہ استاد شافعی المذہب تھے اس لیے ان کو حنفی مذہب مرجوح معلوم ہوا تو دل میں خیال ہوا کہ میں شافعی بن جاؤں۔ چناں چہ اس ارادے کو شیخ ابراہیم سے ذکر کیا، مگر وہ منصف مزاج تھے اور مذاہب اربعہ کو حق سمجھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ مذہب حنفی بھی حق ہے۔ تم کو اس پر جو جو شبہات ہیں، بیان کرو، میں جواب دیتا ہوں۔ چناں چہ سب شبہات کافور ہو گئے۔ پھر نصیحت کی ایک مذہب سے انتقال اچھا نہیں تو آپ مذہب حنفی پر پختہ ہو گئے۔ گو بعض جزوی اختلافات میں محققانہ رنگ رکھا، لیکن فروع میں اتباع احناف ہی کی کرتے رہے۔ چناں چہ مولانا اسماعیل شہید (۱۷۷۹ء۔ ۱۸۳۱ء) جو ان کے پوتے ہیں اور ان کی پرورش شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۵ء۔۱۸۲۲ء) نے کی، ان کا رنگ بھی محققانہ تھا۔ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی لکھتے ہیں کہ جو لوگ اسماعیل شہید کو غیر مقلد کہتے ہیں، وہ جھوٹے ہیں۔ ہم نے ان کو دیکھا ہے کہ وہ حنفی تھے۔ ان کا طرز عمل وہی تھا، جو ان کے دادا کا تھا۔ (۲۷)

چناں چہ امام شاہ ولی اللہ کو مراقبے میں انکشاف ہوا، جس کو ''فیوض الحرمین'' میں لکھتے ہیں:

> عرفنی رسول اللہ ﷺ ان فی المذهب الحنفی طریقة انیقة هی اوفق الطرق بالسنة المعروفة التی جمعت و نقحت فی زمان البخاری و اصحابه (۲۸)
>
> رسول اللہ ﷺ نے حنفی مذہب کے ایک بڑے اچھے طریقے سے مجھے آگاہ فرمایا اور حنفی مذہب کا یہ طریقہ ان مشہور احادیث سے موافق ترین ہے، جو امام بخاری اور ان کے اصحاب کے زمانے میں جمع کی گئیں اور ان کی اس زمانے میں جانچ پڑتال بھی ہوئی۔

بہ ہر حال ان کے بعد ان کی اولاد نے حدیث کی تدریس کو جاری رکھا۔ پھر امام شاہ اسحاق دہلوی (۱۷۷۲ء۔ ۱۸۴۵ء) نے بہت دیر تک اس سلسلے کو جاری رکھا۔ اس کے بعد دہلی درسِ حدیث سے خالی ہو گئی، مگر ان کے شاگرد مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۳۳ء۔ ۱۸۸۰ء)

اور مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۸۲۹ء۔۱۹۰۵ء) نے اردگرد میں علم حدیث دینا شروع کیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مسجد کی شکل میں دیوبند میں سبق شروع کیا، شیخ الہند نے ان ہی سے پڑھا تھا۔ گنگوہ میں مولانا رشید احمد گنگوہی نے مدرسے کی بنیاد رکھی۔

پھر بالمشاورہ دیوبند کی بنیاد رکھی گئی تو صدر المدرسین بہت زمانے تک مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۱۸۳۱ء۔۱۸۸۴ء) رہے۔ پھر شیخ الہند مولانا محمود حسن (۱۸۵۱ء۔۱۹۲۰ء) نے اس مسند کو سنبھالا، پھر ان کے بعد سید انور شاہ کشمیری (۱۸۷۵ء۔۱۹۳۳ء) کے یہ کام سپرد کیا گیا۔ پھر مولانا حسین احمد مدنی (۱۸۷۹ء۔۱۹۵۷ء) نے یہ مسند سنبھالی۔

حجیت حدیث

امت کا اجماع حجیت حدیث پر ہے۔ مگر بعض لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں۔ چناں چہ وہ لوگ جو حدیث کا انکار کرتے ہیں، ان کے تین گروہ ہیں:

☆ پہلا گروہ وہ ہے، جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتا ہے اور حدیث کا انکار کرتا ہے۔

☆ دوسرا گروہ وہ ہے، جو اعتقاداً تو حدیث کا رکھتا ہے، لیکن عمل قرآن پر کرتا ہے۔

☆ تیسرا گروہ زبان سے قرآن وحدیث کو حجت مانتا ہے، مگر عمل کے لحاظ سے اہل قرآن ہے۔

تو اہل قرآن کے تین گروہ ہوئے۔ اس لیے اہل سنت والجماعت کو چاہیے کہ جو مسئلہ قرآن وحدیث سے ثابت ہو، اس کو حدیث سے ثابت کیا جائے۔ تاکہ معلوم ہو کہ سنت رسول بھی احکام کے لیے حجت ہے۔ نیز ہمارے اکابر کے نزدیک دلائل اربعہ، یعنی قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سب حجت ہیں۔ بہ ہر حال حجیت حدیث پر دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآن شریف میں حضور اکرم ﷺ کو حَکَم بنایا گیا ہے اور آپ ﷺ کے فیصلے کو تسلیم کرنا لازم ہے اور آپ جو فیصلہ کریں گے، وہ حدیث ہوگی۔ نیز آپ ﷺ کے فیصلے کو قبول کرنے کو ایمان کا مدار بنایا گیا ہے۔ چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (۲۹)

تیرے رب کی قسم! وہ مومن بنہ ہوں گے، یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے، پھر نہ پائیں تنگی اپنے جی میں تیرے فیصلے سے اور قبول کریں خوشی سے۔

اس آیت میں ایک تو حضور اکرم ﷺ کو حکم تسلیم کیا گیا ہے۔ دوسرا آپ کا فیصلہ خوش دلی سے پسند کرنے کا حکم ہے۔ تیسرا اپنے اوپر لازم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ حدیث کا قبول کرنا مدار ایمان ہے۔

۲۔ اللہ اور رسول کا فیصلہ قبول کرنا لازم ایمان ہے۔ چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا (۳۰)

اور کام نہیں کسی ایمان دار مرد اور عورت کا جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم کر دیں۔

انتفائے لازم مستلزم ہوتا ہے، انتفائے ملزوم کو، تو سلب قبولِ فیصلہ حضور ﷺ سے سلب ایمانی ہوگا۔

۳۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت واجب ہے، ویسے ہی آپ ﷺ کی اطاعت بھی مستقل واجب ہے۔ چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (۳۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

۴۔ حضور اکرم ﷺ کا علم اور عمل دونوں غلطی سے محفوظ ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی وحی غلطی سے محفوظ ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ (۳۲)

اور آپ ﷺ نہیں بولتے اپنے نفس کی خواہش سے۔

اس آیت میں آپ ﷺ کے قول کو وحی کہا گیا ہے اور وحی پر عمل کرنا واجب ہے۔ لہٰذا احادیث پر عمل کرنا بھی واجب ہے۔

۵۔ حضور اکرم ﷺ کی ذات مقدس کو تمام امت کے لیے نمونہ بنایا گیا ہے۔ چناں چہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳)

تحقیق رسول اللہ ﷺ کی ذات میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔

چناں چہ جب آپ ﷺ نمونہ ٹھہرے تو آپ کے قول پر عمل کرنا واجب ہوگا۔

۶۔ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کو امت کی تعلیم اور تربیت کے لیے نمونہ بنایا گیا ہے۔

چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ (۳۴)

تحقیق اللہ نے احسان کیا اہل ایمان پر، جو بھیجا ان میں رسول انہیں میں سے۔

۷۔ حضور اکرم ﷺ کی حدیث قرآن کی تفسیر ہے۔ حکم یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرو مع تفسیر کے، گویا کہ قرآن اور حدیث لازم وملزوم ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ وَاُنْزِلَ اِلَيْهِمْ (۳۵)

اور ہم نے نازل کیا آپ ﷺ پر ذکر (قرآن) تا کہ آپ ﷺ کھول دیں لوگوں کے سامنے وہ چیز، جو ان کے واسطے نازل کی گئی۔

۸۔ حضور اکرم ﷺ کا فیصلہ حجت ہے، جیسے اللہ کا فیصلہ بہ راہ راست حجت ہے۔ چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ (۳۶)

بے شک ہم نے آپ پر سچی کتاب اتاری، تا کہ آپ ﷺ لوگوں کے درمیان انصاف کریں۔

۹۔ حضور ﷺ کی ذات مقدس واجب الاتباع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے تعلق کو حضور اکرم ﷺ کی اتباع کے ساتھ متعلق کیا ہے اور آپ کی اتباع تب ہوگی، جب آپ ﷺ کے فیصلے کو تسلیم کیا جائے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳۷)

آپ ﷺ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری راہ چلو، تا کہ اللہ بھی تم سے محبت کرے۔

منکرین حدیث کا اعتراض

منکرین حدیث کی طرف سے اعتراض ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں احادیث لکھی نہیں گئیں، فقط زبانی یاد کرتے تھے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ انسان ایک دن کی بات دوسرے دن بھول جاتا ہے تو اتنی احادیث صحیح طور پر کون یاد رکھ سکتا تھا؟ لہٰذا یہ احادیث معتمد نہیں ہیں۔
اس اعتراض کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب

پہلا جواب یہ ہے کہ حدیث کے ضبط کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ضبط صدر اور ضبط کتابت (جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا)۔ اس زمانے میں ضبط کتابت نہ تھا اور ضبط صدر کافی سمجھا جاتا تھا۔ آج کے حافظے کو اُن کے حافظے پر قیاس کرنا غلط ہے۔ اس لیے کہ صحابہ صاحب تقویٰ اور صاحب دیانت تھے اور بعد میں تکرار کرتے تھے اور دوسروں تک اس کو پہنچاتے تھے۔ چناں چہ مطلب تھا حدیث کی حفاظت کرنا، خواہ صدر کے ساتھ ہو یا کتابت کے ساتھ۔

دوسرا جواب

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم ہی نہیں کرتے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں ضبط کتابت نہیں تھی، بل کہ ہم کہتے ہیں کہ کثرت سے ضبط کتابت تھی اور اکثریت سے ضبط صدر تھا۔ (۳۸) چناں چہ یہ اعتراض درست نہیں کہ ضبط کتابت بالکلیہ نہ تھی، مثلاً:

☆ ''صحیح بخاری'' میں لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے زبان سے اقرار کرنے والوں کا نام لکھنے کا فرمایا تو تعمیل حکم میں پندرہ سو اصحاب کے نام لکھے گئے۔ (۳۹)

☆ ''طبرانی'' میں ہے کہ حضرت وائل بن حجر جب اپنے وطن کو واپس جانے لگے تو ایک نامہ مختلف احکام پر مشتمل لکھوا کر ان کے سپرد کیا۔ جس میں ربا اور شراب وغیرہ کے متعلق احکام تھے اور فرمایا کہ ان پر عمل کرنا۔ (۴۰)

☆ ''دارمی'' میں ہے کہ حضور ﷺ نے سلاطین کے نام جو خطوط بھیجے تھے، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ نے ان کو کتابت کی شکل میں رکھنے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے

اجازت عطا فرمائی۔(۴۱)

☆ ''صحیح مسلم'' میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے ایک صحیفہ ذمیوں کے احکام کے متعلق لکھوایا۔(۴۲) ''صحیح بخاری'' میں بھی اس کا ذکر ہے۔(۴۳)

☆ ''مستدرک حاکم'' میں ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے آخری زمانے میں تلاوت قرآن، فضائل قرآن، طلاق، دیت اور صدقات کے متعلق احکام ایک ضخیم کتاب میں لکھوا کر عمرو بن حزمؓ کی وساطت سے حاکم یمن کے پاس بھیجا تھا۔(۴۴)

☆ ''بیہقی'' میں ہے کہ حضور ﷺ نے والی حمیر کو زکوٰۃ کے مسائل لکھوا کر بھیجے، جس کا نام ''کتاب الصدقہ'' ہے۔(۴۵) اس کے بعد یہ نسخہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہا۔ ان کے انتقال کے بعد پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے نواسے حضرت سالمؒ کے پاس رہا اور امام شہاب زہریؒ نے حضرت سالمؒ سے لے کر مستقل حفظ کیا۔ بعد میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے زمانے میں اس کو لے کر نقول کروائیں اور اس کی اشاعت کی۔

صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اور بھی تحریرات تھیں اور صحاح ستہ سے قبل بہت سی کتب حدیث موجود تھیں۔(۴۶)

یہ دلائل تو وہ ہیں، جو مطلق حدیث کے حجت ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اب خبر واحد کے حجت ہونے پر دلائل پیش کیے جاتے ہیں:

☆ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب ایک شخص نے آ کر کہا کہ فرعون کی مجلس میں آپ کے قتل کرنے کا پروگرام ہو رہا ہے۔ چناں چہ آپ اس شہر سے نکل جائیں۔ تو آپ نے پیغمبر ہوتے ہوئے خبر واحد پر عمل کیا۔ چناں چہ معلوم ہوا کہ خبر واحد حجت ہے۔

☆ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب حضرت شعیب علیہ السلام کی دو لڑکیوں کو کنویں سے پانی پلایا تو جب وہ گھر گئیں تو حضرت شعیب علیہ السلام نے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلانے کے لیے بھیجا تو آپ اس خبر پر عمل کرتے ہوئے تشریف لائے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ خبر واحد حجت ہے۔

حواشی وتعلیقات

۱۔ ذاتی ڈائری

۲۔ ذاتی ڈائری

۳۔ ذاتی ڈائری

۴۔ علامہ کرمانی نے اس تعریف کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ما اضیف الی النبی ﷺ من قول او فعل او تقریر او وصف خلقی او غیر خلقی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: الکرمانی، محمد بن یوسف۔ الکواکب الدراری۔ داراحیاء التراث العربی، بیروت: ج۲، ص۱۲)۔ ابوالبقاء کے مطابق: وهو الاخبار، ثم سمی به قول او فعل او تقریر نسب الی النبی علیه الصلوٰة والسلام۔ (تفصیل ملاحظہ ہو: ابو البقاء، ایوب بن موسیٰ۔ کلیات ابی البقاء۔ مطبع الامیریہ، مصر، ۱۲۸۰ھ: ص۱۵۲)

۵۔ آل عمران:۳۳

۶۔ الحجرات:۷

۷۔ الفتح:۲۹

۸۔ التوبہ:۱۰۰

۹۔ التوبہ:۸۹

۱۰۔ چناں چہ امام طیبی کے مطابق: الحدیث اعم من ان یکون قول النبی ﷺ والصحابی والتابعی وفعلهم و تقریرهم۔ (تفصیل ملاحظہ ہو: الطیبی، حسن بن عبداللہ۔ الخلاصہ فی اصول الحدیث۔ تحقیق: صبحی السامرائی، مطبعہ الارشاد، بغداد، ۱۹۷۱ء: ص۳۰)۔ ابوشہبہ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ (تفصیل ملاحظہ ہو: ابوشہبہ، محمد بن محمد۔ الوسیط فی علوم و مصطلح الحدیث۔ دار الفکر العربی، بیروت: ص۱۶)

۱۱۔ آل عمران:۱۶۴

۱۲۔ ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ۔ سنن ترمذی۔ دارالفکر، بیروت: ص ۶۴۷۔

۱۳۔ تفصیل ملاحظہ ہو: امام احمد بن حنبل۔ عقیدۃ اہل السنۃ۔ مطبعۃ السنۃ النبویۃ، دمشق: ص ۸۰

۱۴۔ تفصیل ملاحظہ ہو: الطبری، محمد بن جریر۔ تفسیر الطبری۔ داراحیاء التراث العربی، بیروت: ج ۱، ص ۲۵

۱۵۔ النساء: ۳

۱۶۔ نواب صدیق حسن خان نے اس حوالے سے کافی تفصیلی بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

وقد اختلف اهل العلم فی ارسال الثلاث دفعة واحدة هل تقع ثلاث أو واحدة فقط فذهب الی الاول الجمهور و ذهب الی الثانی من عداهم وهو الحق۔

(ملاحظہ ہو: قنوجی، صدیق حسن خان۔ فتح البیان فی مقاصد القرآن۔ المکتبۃ العصریۃ، بیروت: ج ۲، ص ۲۰)

۱۷۔ البقرہ: ۲۲۹

۱۸۔ البقرہ: ۲۳۳

۱۹۔ اس ضمن میں سفیان ثوری کا قول ہے:

ما اعلم عملاً هو افضل من طلب الحدیث لمن اراد اللّٰه تعالیٰ۔

اسی طرح حماد بن سلمہ فرماتے ہیں: **من طلب الحدیث لغیر الله مکر به۔** (تفصیل ملاحظہ ہو: بجستانی، حبیب اللہ بن عطاء۔ آداب الطالب والعالم والحدث۔ مکتبہ محمود سلام، کراچی: ص ۲۱)

۲۰۔ سفیان بن عیینہ اپنے والد کا مقولہ نقل کرتے ہیں: **لن یسعد بالعلماء الا من اطاعهم فاطعمهم تسعد و اخدمهم تقتبس من علمهم۔** (ملاحظہ ہو: نووی، یحییٰ بن شرف۔ تہذیب الاسماء واللغات۔ دارالفکر، بیروت: ج ۱، ص ۲۱۷)

۲۱۔ ابی بن کعب فرماتے ہیں: **تعلموا العلم واعملوا به۔** (ملاحظہ ہو: ابن عبدالبر۔ جامع بیان العلم وفضلہ۔ دارالفکر، بیروت: ج ۲، ص ۸) مشہور محدث ابراہیم بن اسماعیل فرماتے ہیں: **کنا نستعین علی حفظ الحدیث بالعمل به و کنا نستعین علی طلبه بالصوم۔** (ملاحظہ ہو: خطیب بغدادی، ابوبکر احمد بن علی۔ الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع۔ مکتبۃ المعارف، ریاض: ج ۱، ص ۱۴۲)

۲۲۔ القشیری، مسلم بن حجاج۔ صحیح مسلم۔ نور محمد اصح المطابع، کراچی: ج۱، ص۴۲۲
۲۳۔ الہیثمی، علی بن ابی بکر۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد۔ دار الکتاب العربی، بیروت: ج۱، ص۱۵۱
۲۴۔ سلیمان بن اشعث۔ سنن ابوداؤد۔ دار الفکر، بیروت: ص۶۸۵
۲۵۔ مرجع سابق
۲۶۔ ابن عبدالبر۔ جامع بیان العلم وفضلہ: ج۱، ص۸۴
۲۷۔ پانی پتی، عبدالرحمٰن۔ کشف الحجاب: ص۱۱
۲۸۔ الدہلوی، شاہ ولی اللہ۔ فیوض الحرمین۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدر آباد: ص۶۰۔۵۹
۲۹۔ النساء:۶۵
۳۰۔ الاحزاب:۳۶
۳۱۔ النساء:۵۹
۳۲۔ النجم:۳
۳۳۔ الاحزاب:۲۱
۳۴۔ آل عمران:۱۶۴
۳۵۔ النحل:۴۴
۳۶۔ النساء:۱۰۵
۳۷۔ آل عمران:۳۱
۳۸۔ ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے اپنی کتاب (Studies in the early Hadith Literature) میں ایسے ۴۸ مجموعہ ہائے حدیث کا ذکر کیا ہے، جو صحابہ کرامؓ کے زمانے میں مرتب ہو چکے تھے۔ اسی طرح اس کتاب میں تابعین کے ۲۵۰ مجموعہ ہائے حدیث کا بھی ذکر ہے، جو اس دور میں کتابت حدیث کا بین ثبوت ہے۔
۳۹۔ البخاری، محمد بن اسماعیل۔ صحیح بخاری۔ نور محمد اصح المطابع، کراچی: ج۱، ص۴۳۰
۴۰۔ الطبرانی، سلیمان بن احمد۔ المعجم الصغیر۔ دار احیاء التراث العربی، بیروت: ج۱، ص۲۴۱
۴۱۔ الدارمی، عبداللہ بن عبدالرحمٰن۔ سنن دارمی۔ دار الفکر، بیروت: ج۱، ص۱۰۴
۴۲۔ صحیح مسلم: ج۱، ص۴۲۲
۴۳۔ صحیح بخاری: ج۱، ص۲۱

۴۴۔ الحاکم، محمد بن عبداللہ۔ المستدرک۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت: ج۱، ص۵۵۲

۴۵۔ بیہقی، احمد بن حسین۔ سنن کبریٰ۔ دارالکتب العلمیہ، بیروت: ج۴، ص۱۴۵

۴۶۔ عہد رسالت وعہد صحابہ میں کتابت حدیث کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''تدوین حدیث'' اور ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے (Studies in the early Hadith Literature) میں اس موضوع پر بڑی عمدہ تحقیق پیش کی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ''صحیفہ ہمام بن منبہ'' کو تلاش کرنے کے بعد ایڈٹ کیا، جس نے یہ ثابت کیا کہ حدیث کی تدوین بہت پہلے ہو چکی تھی۔